باب 15

اُردو میں داستان گوئی کی روایت

داستان اس طویل مہماتی کہانی کو کہتے ہیں جس میں عام طور پر فرضی اور خیالی واقعات بیان کیے گئے ہوں۔ ان میں ہماری جانی پہچانی دنیا نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس میں جانور اور پرندے بولتے سنائی دیتے ہیں۔ چڑیلیں اور جادوگر ہی نہیں، سونے اور چاندی کے پہاڑ بھی ہماری حیرت میں اضافہ کرتے ہیں۔ جہاں بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں، وزیر اور وزیر زادے جیسے کردار ہوتے ہیں، وہیں جنوں، دیووں اور پریوں کے ذکر سے اسے دلچسپ بنایا جاتا ہے۔ داستانیں خیالی اور فرضی ہونے کے باوجود بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ ہمارے قدیم تہذیب وتمدن اور معاشرتی زندگی کے مطالعے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

قصے، کہانیوں کے ذریعے حیرت انگیز، طلسماتی اور مہماتی واقعات کو سننا اور سنانا انسان کا محبوب مشغلہ اور تفریح کا سامان رہا ہے۔ اسی لیے قدیم زمانے سے قصّے سننے اور سنانے کی روایت عوام اور خواص میں یکساں مقبول رہی ہے۔ بادشاہوں کے درباروں اور امرا کی محفلوں میں اس روایت کو مزید فروغ حاصل ہوا جہاں داستانیں کہنے اور سننے کا رواج عام تھا۔

سترھویں صدی سے اردو میں داستان نگاری کا آغاز ہوا اور کئی ادبی داستانیں لکھی گئیں۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح داستانیں بھی پہلے دکن میں وجود میں آئیں۔ ملا وجہی کی 'سب رس' کو اردو کی اوّلین نثری داستان تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ عیسوی خاں، عطا حسین خاں تحسین، شاہ عالم ثانی، میر امن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور نے داستان نگاری کی اس روایت کو آگے بڑھایا۔

ملا وجہی (1562-1659) : ان کے حالاتِ زندگی باب دوم میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

ملا وجہی کی 'سب رس' اردو میں ادبی نثر کی پہلی تصنیف ہے۔ انھوں نے اسے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1635 میں لکھا تھا۔ اس عشقیہ قصّےکو وجہی نے 'نوی بات' کہا ہے۔ یہ محمد یحییٰ فتاحی نیشاپوری کی فارسی مثنوی 'دستورِ عشاق' کے نثری خلاصے 'قصۂ حسن ودل' سے ماخوذ ہے۔ 'سب رس' ایک تمثیلی داستان ہے۔ اس کے کردار انسانی جسم کے اعضا ہیں۔

'عقل' سیستان کا بادشاہ ہے۔ اس کے لڑکے کا نام 'دل' ہے جو 'تن' کے ملک پر حکمرانی کرتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے 'سب رس' کی اہمیت دو وجہ سے ہے: اوّل یہ کہ یہ اردو نثر کا پہلا ادبی کارنامہ ہے۔ اس سے پہلے کی جو نثری کتابیں یا رسالے اب تک دریافت ہوئے ہیں، ان کی ادبی حیثیت بہت بلند نہیں ہے۔ اس کے برخلاف سب رس میں اسلوب کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ دوسرا یہ کہ تمثیل کے لحاظ سے بھی یہ ایک منفرد داستان ہے۔

'سب رس'، مسجّع و مقفّٰی اور رنگین اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تشبیہ اور استعارے اور مختلف صنعتوں کا بھی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

عیسوی خاں (و۔ 1750): نواب عیسوی خاں کا خاندان کشمیر سے آکر دہلی میں بس گیا تھا، یہیں ان کی پیدائش ہوئی۔ جوانی میں گوالیار چلے گئے۔ وہ سنسکرت اور ہندو دیو مالا سے واقف تھے۔ ان کی تصنیف 'قصۂ مہر افروز و دلبر' شمالی ہند کی اوّلین داستان ہے۔

ڈاکٹر پرکاش مونس 'قصۂ مہر افروز و دلبر' اور 'رس چندریکا' کی عبارت کا باہم مقابلہ کرکے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں کتابوں کے مصنف عیسوی خاں ہیں۔ عیسوی خاں گوالیار کے راجا چھتر سنگھ کے متوسّل تھے۔ 'قصۂ مہر افروز و دلبر' کا مخطوطہ بھی گوالیار ہی میں دستیاب ہوا تھا۔ اس سے مونس کے خیال کو تقویت ملتی ہے۔

یہ داستان دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصّے میں اصل قصہ ہے اور دوسرے حصّے میں نصائح درج ہیں۔ یہ داستان بھی قصّے اور پلاٹ کے لحاظ سے دوسری داستانوں جیسی ہی ہے مثلاً بادشاہ کا بے اولاد ہونا، فقیر کی دعا سے اولاد ہو جانا، شہزادے کا مختلف آفتوں میں گھِرنا، پریوں کے دیس میں پہنچنا، کامیاب ہو کر وطن واپس لوٹنا وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ اس داستان کے اہم کردار مہر افروز اور دلبر ہیں لیکن کہانی کی تکنیک کی وجہ سے کرداروں میں اور جزوی واقعات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ 'مہر افروز و دلبر' کی زبان میں علاقائی اثرات نمایاں ہیں۔

تحسینؔ: ان کا نام میر حسین عطا خاں تھا۔ وہ اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد باقر شوق فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں وہ سہ ہزاری منصب پر فائز تھے۔ انقلاباتِ زمانہ کے تحت تحسین شمالی ہند کو خیر باد کہہ کر بنگال چلے گئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین میں شامل ہو گئے۔ ان کے مربی جنرل اسمتھ ان کی فارسی دانی سے بہت متاثر تھے۔ جب وہ اسمتھ کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر کولکتہ جا رہے تھے تو راستے ہی میں 'نوطرزِ مرصّع'

لکھنے کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوا۔ انھوں نے نوطرزِ مرصع کا ابتدائی حصّہ 69-1768 میں لکھ لیا تھا۔ مگر اس کی تکمیل 1775 میں فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ کی ایما پر ہوئی۔

نوطرزِ مرصّع فارسی کے مشہور قصّے 'قصّۂ چہار درویش' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کی زبان مرصّع اور دقیق ہے۔ گذشتہ داستانوں کی طرح یہ داستان بھی قصہ در قصّہ آگے بڑھتی ہے اور اس کا ہیرو اپنی مراد کو پہنچتا ہے۔ تحسین کا یہ ترجمہ زبان و بیان کے لحاظ سے ادق تھا۔ اس لیے جان گلکرسٹ نے میر امّن کو اسی قصّے کو آسان اردو میں لکھنے کے لیے کہا تھا۔

شاہ عالم ثانی (1806-1727/28) : شاہ عالم ثانی کا اصل نام مرزا عبداللہ اور تخلص آفتابؔ تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ غلام قادر روہیلہ نے ان کی دونوں آنکھیں نکال لی تھیں۔ شاہ عالم ثانی شعر و ادب سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ فنِ خطاطی، فنِ انشا اور سپہ گری میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اردو کے علاوہ برج بھاشا میں بھی شاعری کی۔ 'نوادراتِ شاہی' ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ داستانی ادب میں انھیں 'عجائب القصص' کی وجہ سے شہرت ملی۔ یہ ان کی مشہور داستان ہے۔ نابینا ہونے کی وجہ سے انھوں نے اسے اپنے منشیوں سے املا کرایا ہے۔

عجائب القصص میں خطا و ختن کے بادشاہ مظفر شاہ کے بے اولاد ہونے کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ اس قصے میں کوئی رنگارنگی اور ندرت نہیں ہے۔ البتہ اس میں آدابِ سلطنت اور نظامِ حکومت کی باریکیاں ضرور سمجھائی گئی ہیں، جن کا خود بادشاہ کے یہاں فقدان تھا۔ اس داستان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں غیر ضروری عربی فارسی الفاظ سے گریز کیا گیا ہے۔ اس کی زبان 'باغ و بہار' سے قریب اور 'نوطرزِ مرصّع' اور 'نوآئینِ ہندی' سے مختلف ہے۔

میر امّن (1837-1750) : میر امّن کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ ان کے بزرگ مغل دربار میں صاحبِ منصب و جاگیر تھے۔ اٹھارھویں صدی کے نصفِ آخر میں جب دہلی سلطنت کی بنیادیں ہلنے لگیں اور ان کی جاگیر ضبط ہوگئی تو وہ دہلی چھوڑ کر پہلے عظیم آباد آئے اور پھر کولکتہ پہنچے۔ منشی میر بہادر علی حسینی کے توسّط سے گلکرسٹ تک ان کی رسائی ہوئی اور 4/مئی 1801ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے میں منشی مقرر ہوئے۔ میر امّن جون 1806 تک اس کالج میں رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے دو کتابیں 'باغ و بہار' اور 'گنجِ خوبی' تالیف و ترجمہ کیں۔ انھیں شہرت 'باغ و بہار' سے ملی جس میں چار درویشوں کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ میر امّن نے باغ و بہار میں دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کر کے اردو نثر نگاری میں سادہ اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ ان کی دوسری کتاب 'گنجِ خوبی' ہے جو ملا واعظ کاشفی کی فارسی کتاب 'اخلاقِ محسنی' کا اردو ترجمہ ہے۔ وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا تخلص لطفؔ تھا۔

فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبانوں کے شعبے کے صدر ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو انگریز افسروں کو اردو سکھانے کے لیے آسان اردو میں لکھی ہوئی کتابیں درکار تھیں۔ انھوں نے میر امن سے فارسی کے مشہور قصے 'قصّہ چہار درویش' کو آسان اردو میں ترجمہ کرنے کو کہا۔ میر امّن نے یہ کام 1801 میں شروع کیا اور 1802 میں باغ و بہار کے نام سے مکمل کر دیا۔ اس کتاب میں روزمرہ کی زبان استعمال کی گئی ہے جو عوام میں رائج تھی۔ باغ و بہار میں دہلی کے رسم و رواج، لباس، مشاغل وغیرہ کا نہایت خوش اسلوبی سے بیان ہوا ہے۔ اردو کی نثری داستانوں میں اسے زبان و بیان کے اعتبار سے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ گارساں دتاسی اس کتاب کا بڑا شیدائی تھا۔ اس نے اپنے کئی خطبات میں 'باغ و بہار' کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔

انشاء اللہ خاں انشا (1752/56-1817) : ان کے حالاتِ زندگی باب پانچ میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

'رانی کیتکی کی کہانی' ایک تجرباتی نثری قصہ ہے۔ اس میں 'کنور اودے بھان' اور 'رانی کیتکی' کے عشقیہ قصّے کو بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کے اعتبار سے اس میں بھی وہ سب عناصر موجود ہیں جو دوسری داستانوں میں ملتے ہیں۔ اس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار شعوری طور پر عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کے استعمال کے بغیر اردو نثر لکھنے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ رانی کیتکی کی عبارت میں سو فی صد الفاظ خالص ہندوستانی ہیں۔ جس سے اس کا اسلوب بالکل اچھوتا ہو گیا ہے لیکن اس میں وہ دل کشی پیدا نہیں ہو سکی جو روزمرہ اور محاوروں کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔

حیدرؔی (1768/69-1813/14) : ان کا نام سید حیدر بخش اور تخلص حیدرؔی تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ان کے والد معاشی پریشانیوں کے سبب دہلی چھوڑ کر بنارس چلے گئے۔ وہاں سے کولکتہ پہنچے اور فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا شمار کالج کے اہم نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ یہ اس کالج کے مصنفوں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تالیفات کی تعداد تیرہ ہے۔ انھوں نے فارسی قصّہ 'حاتم طائی' کا ترجمہ 'آرائشِ محفل' کے نام سے کیا جو میر امّن کی 'باغ و بہار' کے بعد سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ ان کی دوسری کتاب 'طوطا کہانی' ہے جو سید محمد قادری کے فارسی 'طوطی نامہ' کا ترجمہ ہے۔ ان کے علاوہ 'قصّہ مہر و ماہ'، 'قصّہ لیلیٰ مجنوں'، 'گلدستۂ حیدری'، 'گلشنِ ہند'، 'گلزارِ دانش'، 'ہفت پیکر' وغیرہ کتابیں بھی لکھیں۔ آخری عمر میں انھوں نے ملازمت چھوڑ دی اور بنارس چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

یوں تو سید حیدر بخش حیدری نے متعدد کتابیں لکھیں لیکن ان میں سے اکثر نایاب ہیں۔ البتہ 'طوطا کہانی' اور 'آرائشِ محفل' اب بھی دستیاب ہیں۔ 'آرائشِ محفل' حاتم طائی کے سات سفروں کی داستان ہے۔ حیدری نے اسے

جان گلکرسٹ کی فرمائش پر 1802 میں فارسی سے ترجمہ کیا تھا۔ حیدری نے ترجمہ کی زبان کو بجائے اردو کے ریختہ کہا ہے۔ یہ کتاب چونکہ سلیس اور روزمرہ زبان میں لکھی گئی ہے اس لیے کافی مقبول ہوئی۔ حیدری کا طرزِ تحریر سادہ اور پُرکشش ہے۔ وہ مقفّیٰ اور مرصّع عبارت نہیں لکھتے لیکن عربی فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ آرائشِ محفل کی داستان بھی قصّہ در قصّہ آگے بڑھتی ہے۔ پہلا سفر ختم ہوتے ہی دوسرے سفر کی کہانی شروع ہوجاتی ہے۔ حاتم طائی کی مہمات کا تذکرہ ان کے یہاں بڑے مؤثر انداز میں ہوا ہے۔ منظر کشی اور مہمات کے احوال کا بیان وہ اس طرح کرتے ہیں کہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

رجب علی بیگ سرؔور (1786-1869) : سرؔور لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انھیں عربی فارسی کے علاوہ فنِ خطاطی اور موسیقی پر بھی قدرت حاصل تھی۔ غازی الدین حیدر نے کسی بات پر ناراض ہوکر اُنھیں جلاوطن کر دیا تو سرؔور کان پور چلے گئے۔ اسی جلاوطنی کے زمانے میں انھوں نے اپنی کتاب 'فسانۂ عجائب' لکھی۔ نصیرالدین حیدر نے ان کا قصور معاف کر دیا اور اُنھیں لکھنؤ آنے کی اجازت دے دی۔ 'فسانۂ عجائب' فورٹ ولیم کالج کے باہر کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب کی شہرت کی وجہ اس کا اندازِ بیان ہے۔ اس کی عبارت پرتکلف اور فارسی آمیز ہے۔ اُس عہد میں نثر کا یہی انداز پسندیدہ تھا۔ اسی لیے 'فسانۂ عجائب' مقبول ہوئی۔ 'سرورِ سلطانی'، 'شگوفۂ محبت'، 'گلزارِ سرور'، 'شبستانِ سرور'، 'فسانۂ عبرت' اور 'شرارِ عشق' سرؔور کی دیگر اہم تصانیف ہیں۔ آخر عمر میں وہ لکھنؤ سے بنارس چلے گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

فسانۂ عجائب سرؔور کی اہم ترین تصنیف ہے۔ یہ حسن و عشق کا افسانہ ہے جس کی عبارت پرتکلّف، مقفّیٰ اور مسجّع ہے۔ یہ داستان لکھنوی اسلوبِ نگارش کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں تشبیہ اور استعارے کے علاوہ کہیں کہیں وزن اور قافیے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

مہر چند مہر کھتری کی 'نوآئینِ ہندی'، نہال چند لاہوری کی 'مذہبِ عشق'، میر بہادر علی حسینی کی 'نثرِ بے نظیر'، سید حسین شاہ حقیقتؔ کی 'جذبِ عشق'، فقیر محمد گویاؔ کی 'بُستانِ حکمت'، محمد بخش مہجورؔ کی 'گلشنِ نوبہار' اور عظمت اللہ نیازؔ دہلوی کی 'قصۂ رنگین گفتار' کا شمار بھی اردو کی اہم داستانوں میں ہوتا ہے۔